ڈاکٹر محمد خاور نوازش
استاد، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریایونیورسٹی ملتان

# اُردو افسانہ اور پنجاب کی دو تہذیبی روحیں:
# احمد ندیم قاسمی اور منشایاد تجزیہ و تقابل

**Dr. Muhammad Khawar Nawazish**
Assistant Professor, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

## Urdu short story and two spiritual expressionists of Punjab: Ahmad N. Qasmi and Mansha Yad (A Comparative Analysis)

Ahmad Nadeem Qasmi and Mansha Yad are two credible references to Urdu short story. They focused on the rural life of Punjab Pakistani Punjab in most of their fictional writings. Punjab, with its liveliness and vitality, had descended into their souls. So, they were fully aware of the life of the primitive classes of this region. Ahmad Nadeem Qasmi was associated with Progressive Writers Movement, so he considered social conditions more important than literary aesthetics while Mansha Yad gave equal importance to the artistic structure of his fiction in accordance to the thoughts of Halqa-e-Arbab-e-Zauq. This research paper presents a comparative study of the short stories of both writers in the context of illustrating rural life of Punjab.

**Key Words:** *Short story, Fiction, Nadeem, Mansha, Punjab, Rural, Primitive, Classes.*

مجلہ 'نقوش کے "افسانہ نمبر" ۱۹۵۰ء میں اُردو افسانہ اور اُس کی روایت کے موضوع پر ایک دلچسپ مذاکرہ شامل ہے جس میں منٹو، احمد ندیم قاسمی، وقار عظیم، عبادت بریلوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، شوکت تھانوی، حمید اختر اور محمد طفیل شرکائے گفتگو ہیں۔ اس میں افسانے کی ایک نہایت سہل تعریف کرتے ہوئے منٹو کہتے ہیں:

> "ایک تاثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کر کے اُسے اِس انداز سے بیان کر دینا کہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے، یہ افسانہ ہے۔"(۱)

اِسی گفتگو کے دوران آگے چل کر مزید کہتے ہیں:

"زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں.... اور یہی آرٹسٹ کا نقطۂ نظر ہونا چاہیے..... افسانہ نگار کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک چیز لکھے اور وہی آپ کو زندگی میں بھی مل جائے۔"(۲)

اب یہ منٹو کی شرارت بھی ہو سکتی ہے کہ اس مثال کے لیے انھوں نے اپنے بے رحم نقاد اوپندر ناتھ اشک کا نام لیا تاہم بات بہت اہم کی ہے کہ افسانہ نگار اپنے قاری کے سامنے زندگی کو اُس زاویے سے پیش کرتا جس سے اُس نے پہلے نہ دیکھا ہو یا اگر دیکھا بھی ہو تو ایسے سرسری انداز میں کہ کوئی گہرا تاثر نہ ابھرا ہو۔ گویا افسانہ اصل میں ہے ہی زاویۂ نظر کا مرقع اور افسانہ نگار کی فنی حیثیت کا تعین بھی اسی بنیاد پر ہوتا ہے۔ زاویۂ نظر کی یہ تخصیص اُردو کے افسانہ نگاروں کے ہاں زندگی کے انفرادی مفاہیم اور مختلف رنگوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اُردو افسانے کی روایت میں جو مختلف فکری رجحانات ملتے ہیں یہ دراصل مذکورہ تخصیص ہی کی بنیاد پر آگے بڑھے۔ یہ تخصیص صرف ادیب نہیں بلکہ معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ ہوتی ہے لیکن ہر فرد کے پاس غالباً اُسے پیش کرنے کی وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو ایک ادیب کے پاس ہوتی ہے۔ پھر ہر ادیب کی ذاتی زندگی کے تجربات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اُردو کے یوں تو کم و بیش ہر بڑے افسانہ نگار نے ہندوستان کی دیہی زندگی کو اپنے افسانوں میں موضوع بنایا ہے لیکن دیہی زندگی کا ذاتی تجربہ جس طرح پریم چند، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور منشایاد کے افسانوں میں پوری تہذیبی پیش کش بن کر سامنے آتا ہے وہ کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتا۔ گو کہ اِن تمام افسانہ نگاروں کا لوکیل ہندوستان کے مختلف خطوں کے دیہات ہیں لیکن ان میں قدرِ مشترک ماحول، کہانی اور کرداروں کے ذریعے ابھرنے والی زندگی کی وہ صداقت ہے جو دیہاتی زندگی کے ذاتی تجربے کے بغیر پیش کرنا ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ ہندوستان دیہاتوں کا شہر ہے یا ہندوستان کی اصل زندگی دیہاتوں میں موجود ہے۔ مذکورہ افسانہ نگاروں نے اُسی ہندوستانی زندگی کے مختلف تاثرات کو اپنے افسانوں کے ذریعے قارئین تک منتقل کرنے کی کوشش ہے۔

پریم چند ۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء اُردو کے وہ پہلے بڑے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کو موضوع بنایا۔ وہ ایک سماجی حقیقت نگار ضرور ہیں لیکن اُن کے روبرو ایک نصب العین بھی تھا جس پر وہ ہندوستانی معاشرے کو استوار دیکھنا چاہتے تھے۔ استعماریت کے خلاف اپنی نفرت کو انھوں نے دیہات کی سادہ لوحی میں دیکھنے کی خواہش ہمیشہ زندہ رکھی۔ تاہم سیاسی شعور کو سماجی انصاف کی آرزومندی سے بھی جوڑے رکھا۔ پریم چند کی ناول نگاری کے بارے میں فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ جس طرح حالی اور اُن کے رفقا نے اُردو شاعری کو نوابین کے

درباروں سے نکال کر عام سفید پوش شرفا کی محفل میں لا بٹھایا تھا اسی طرح منشی پریم چند اُردو ناول کو سفید پوش شرفا کی بیٹھکوں میں سے نکال کر دیہات کی چوپالوں میں لے گئے[۳] یہ بات صرف ناولوں نہیں بلکہ افسانوں پر بھی صادر آتی ہے۔ منشی پریم چند نے افسانے کی صنف کو بھی ہندوستان کی اُس زندگی تک پھیلایا جو بقول مہاتما گاندھی اصل ہندوستان ہے۔ منشی پریم چند نے اپنے کرداروں کا دائرہ کسی ایک گروہ تک محدود نہ رکھا کیونکہ وہ راشد الخیری سے کیے گئے اپنے اس شکوے کہ آپ نے جو کچھ لکھا صرف مسلمانوں کے لیے لکھا، کو خود پر نہیں لینا چاہتے تھے۔ پریم چند کو اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز سے ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ ظالم، جاگیر دار اور استحصال کرنے والے کا ماسوائے طاقت کے کوئی مذہب، گروہ یا عقیدہ نہیں ہوتا۔

منشی پریم چند کے بعد اگر کسی نے دیہاتی زندگی کی سختی، جفاکشی اور کھردرے پن کو اپنی پوری توانائی کے ساتھ موضوع بنایا ہے تو وہ بلونت سنگھ ۱۹۲۱ء۔۱۹۸۶ء ہیں۔ بلونت سنگھ کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے اُردو فکشن میں خالص دیہاتی معاشرت کی پیش کش کا دائرہ یو۔پی سے پنجاب تک بڑھا دیا لیکن اُن پر یہ گہری چھاپ لگ گئی کہ انھوں نے پنجاب کے سکھوں کی زندگی کو زیادہ موضوع بنایا۔ شمس الرحمن فاروقی نے بلونت سنگھ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پنجاب کے جاٹ سکھوں کے افسانہ نگار ہیں[۴]، تاہم اُن کے افسانوں میں مسلمان کردار بھی موجود ہیں اور پوری فکری توانائی رکھتے ہیں۔ 'ویسلے ۳۸' وہ افسانہ ہے جس کے بسا کھ سنگھ کا یہ کہنا کہ "اب مذہب صرف دورِہ گئے ہیں ، ایک دوسروں کو خون چوسنے اور لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا اپنا خون دینے اور لٹنے والوں کا مذہب"[۵]، بلونت سنگھ کو ہر طرح کی مذہبی اور گروہی پہچان سے بہت اوپر اُٹھا دیتا ہے اور یہ بسا کھ سنگھ کا یہ جملہ اُس پورے پنجاب کا نوحہ بن جاتا ہے جس سے بلونت سنگھ کو سچی اور گہری محبت تھی اور جس پنجاب کے چہرے پر تقسیم کے لہو کے چھینٹے پڑ چکے تھے۔

پنجاب کی دیہاتی زندگی کو بلونت سنگھ کے علاوہ اُردو کے جس افسانہ نگار نے سب سے زیادہ موضوع بنایا وہ احمد ندیم قاسمی ۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے جو دائرہ بلونت سنگھ کے گرد جاٹ سکھوں کا افسانہ نگار کہہ کر کھینچا وہ احمد ندیم قاسمی کے گرد بھی پنجابی مسلمانوں کا افسانہ نگار کہہ کر کھینچا جا سکتا تھا کیونکہ قاسمی صاحب نے بھی پنجاب کی دیہی زندگی کے مسلم معاشرے کو زیادہ موضوع بنایا ہے لیکن اُن کے ہاں بھی ہندو اور سکھ کردار موجود ہیں اور اپنے پورے ثقافتی اظہار کے ساتھ آتے ہیں۔ اس ضمن میں 'کریا کرم' اور 'پرمیشر سنگھ' ایسے افسانوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی میں اگر کوئی فرق کرنا مقصود ہو تو ایک تو وہ یہ ہو سکتا ہے

کہ بلونت سنگھ نے خالصتاً دیہات کی زندگی پر احمد ندیم قاسمی سے بہت کم لکھا ہے، دوسرا فرق لوکیل کا ہو سکتا ہے۔ بلونت سنگھ کا لوکیل مشرقی پنجاب ہے جبکہ قاسمی صاحب کے افسانے زیادہ تر پنجاب کے شمال مشرقی حصے کی دیہی زندگی کے عکاس ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا آبائی علاقہ اسی جغرافیائی حدود میں واقع وادی سون سکیسر ہے۔ یہ پنجاب کا وہ حصہ ہے جو دیہی زندگی کے تمام تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول اور فضا کی بنیاد پر رومان کی چاشنی لیے ہوئے بھی ہے۔ یہی رومان کی چاشنی احمد ندیم قاسمی کے ہاں دیہی معاشرت کی عکاسی اور اس سے متعلق افسانوں کی زبان میں بھی نظر آتی ہے لیکن بلونت سنگھ کا اسلوب نسبتاً تلخی لیے ہوئے ہے۔

اُردو افسانے میں دیہاتی زندگی کی عکاسی پر اب تک سب سے بنیادی کام ڈاکٹر انور سدید کا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے اولین مقالہ ۱۹۷۵ء میں لکھا جو پہلے مجلہ 'اوراق' اور پھر اُن کی کتاب 'فکر و خیال' میں شائع ہوا۔ بعد ازاں اس پر مکمل کتاب 'اُردو افسانے میں دیہات کے پیش کش' کے عنوان سے لکھی جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں دیہات کو بالخصوص افسانے کا موضوع بنانے کے حوالے سے وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ:

> "دیہات کی تہذیب شہر کے تمدن سے خاصی مختلف ہے۔ دیہات زمین کے ساتھ چمٹا ہوا ہے لیکن اس کی نظر ہمیشہ آسمان کی طرف رہتی ہے۔ برکھا بروقت ہو تو زمین سیر اب ہو جاتی ہے اور فصل پکنے کی امید تازہ ہو جاتی ہے۔ بصورتِ دیگر کسان بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دیہات کی اس نوعیت نے اس کے بنیادی مزاج کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ان سادہ دل لوگوں کی جذباتی زندگی میں خوشی بلاشبہ اہمیت رکھتی ہے اور غم نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تاہم اول الذکر کے حصول اور موخر الذکر کے وارد ہونے کے انداز الگ الگ ہیں۔"(۶)

دیہاتی فضا اور ماحول فطرت کے قریب تر ہونے کہ وجہ سے زندگی کی اُن حقیقتوں کے مرقعے پیش کرتے ہیں جو شہری تمدن میں کہیں دب جاتی ہیں۔ گو کہ اس ماحول کی تصویر کشی مختلف زاویۂ نظر سے مختلف افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے لیکن احمد ندیم قاسمی نے اس موضوع پر سب سے زیادہ لکھا اور سب سے زیادہ تنوع بھی اُنھی کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ وہ دیہاتی زندگی میں غربت، ناخواندگی، ناانصافی، طبقاتی استحصال، صنفی امتیازات، بے روزگاری، توہم پرستی، بیماری، مذہبی منافقت ایسے تلخ موضوعات کے ساتھ پنجاب کے موسموں، دریاؤں، درختوں، ٹیلوں، ریگستان، چرند پرند، کھیتوں، کھلیانوں، چراگاہوں، کھانوں اور لباس وغیرہ کا ذکر بھی اس خطے سے گہری محبت اور وابستگی کے اظہار کے طور پر کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے بعد پنجاب کی دیہاتی معاشرت سے جڑا ہوا ایک اور بڑا نام منشایاد ۱۹۳۷ء۔۲۰۱۱ء ہے۔ دیہات اُن کے وجود میں اُترا ہوا نظر آتا ہے اور وہ دیہاتی زندگی کو پیش کرنے کے لیے اپنے وجود کو ٹٹولتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے دیہاتی کرداروں میں پنجاب کی لوک ریت کا بہت گہرا رَس نمایاں ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد رقم طراز ہیں:

> "بطور افسانہ نگار اُس کی انفرادیت تین حوالوں سے قوت حاصل کرتی ہے، ایک اُس کی معصوم دہقانیت، دوسرے پنجاب کے لوک گیتوں اور لوک دانش کا رَس اور تیسرے افسانے کی روایت سے اُس کی تخلیقی وابستگی۔ اُس کی زبان میں اُس معاشرت کا ذائقہ موجود ہے جس کی مٹی سے وہ کردار اور اپنے افسانے کی فضا تخلیق کرتا ہے۔"(۷)

گذشتہ صفحات میں اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش کے حوالے سے جن چار افسانہ نگاروں کا حوالہ آیا ہے اُن میں سے احمد ندیم قاسمی اور منشایاد اس لیے قریب ہیں کہ دونوں کی کہانیوں کا لوکیل کم و بیش ایک سا ہے۔ دونوں نے پاکستانی پنجاب کی زندگی پر گزرنے والے مختلف زمانوں کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ اِس زندگی کی معصومیت میں اترنے والی تلخیوں، اُن تلخیوں سے بننے والی نفسیات اور اُس نفسیات کی سانسیں بننے والی اس خطے کی رومانیت کو دونوں افسانہ نگاروں نے ایک ساتھ محسوس کیا۔ یہ دونوں افسانہ نگار دیس پنجاب کی دو ایسی تہذیبی روحیں ہیں جن کی کہانیوں کے موضوعات اور کرداروں کے ساتھ ساتھ مناظر نگاری میں بھی مماثلتیں موجود ہیں۔

احمد ندیم قاسمی چونکہ ایک مخصوص آئیڈیالوجی سے بھی وابستگی رکھتے تھے سو اُن کے افسانوں میں جو دیہاتی سماج نظر آتا ہے اس میں محبت کے بنیادی جذبے کے ساتھ ساتھ طاقتور اور کمزور طبقے کی کشمکش بھی موجود ہے۔ 'چوپال' اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس کے کم و بیش سبھی افسانے دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں کسانوں کی غربت، بھوک اور بے روزگاری، زمینداروں اور جاگیرداروں کے تحکمانہ رویے، عزت اور غیرت کے نام نہاد معیارات وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس مجموعے میں یوں تو سبھی افسانے متذکرہ موضوعات کے حوالے سے قابلِ ذکر ہیں لیکن 'انتقام' اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس میں صرف دیہی معاشرت کی پیش کش نہیں بلکہ اُس معاشرت کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس افسانے میں رئیس زادہ اکبر اپنے دو دشمنوں فتو اور سرخو سے انتقام کی ایسی راہ اختیار کرتا ہے کہ اپنے معاشرے کی نظروں میں مزید باعزت بھی بن جاتا ہے اور اپنی جنسی ہوس کی بھی تسکین کرتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر فتو اور سرخو کی بہن کے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

"پیارے اکبر! تم نے اتنی بڑی قربانی دی ہے کہ شاید ہی اس علاقے میں کبھی کسی نے دی ہو۔ تم نے میرے بھائیوں کی جان بچا کر اپنے اس پیار کا ثبوت دیا ہے۔ آج کے بعد بھی اگر میں تمہارے پیار کا جواب خاموشی سے دوں تو مجھ جیسی کمینی لڑکی شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہو!۔"(۸)

احمد ندیم قاسمی کے ایسے کئی افسانے ملتے ہیں جن میں عورت اور اس کا جسم اپنے گھر اور خاندان کے جان و مال کے لیے ڈھال بنتے ہیں۔ افسانوی مجموعے 'طلوع و غروب' میں شامل افسانہ 'میرا دیس' میں ایک زمیندار نے کسان کو جو ایک بیگھہ زمین کاشت کرنے اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے دے رکھی ہے اُس کی اصل قیمت کسان کی بیٹی ادا کرتی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"زمیندار جی آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟۔۔۔ آپ میری جوانی چاہتے ہیں نا۔۔۔ لے لیجئے میری جوانی اور مجھے رخصت کیجیے کہ میرے بوڑھے ماں باپ پڑے کراہ رہے ہوں گے۔ آپ کی یہ مہربانی کیا کم ہے کہ شام کی اس ذرا سی روحانی اور جسمانی محنت کا صلہ آپ یوں دے رہے ہیں کہ میرے بوڑھے ماں باپ کو ایک بیگھہ زمین کاشت کے لیے دے رکھی ہے۔ جلدی کیجیے مجھے جانا ہے۔"(۹)

منشایاد کے افسانے 'ساجھے کا کھیت' میں بھی گاؤں کا چودھری موجو موچی کو ایک ایکڑ زمین حصے پر دیتا ہے تاکہ موجو موچی کی بیوی تانی جسے چودھری شریف دوسرے گاؤں سے بھگا کر لایا تھا لیکن خاندانی دباؤ کی وجہ سے اپنے ساتھ رکھنے کی بجائے موجو موچی سے بیاہ دیتا ہے، اچھا گزر بسر کر سکے۔ ساجھے کے کھیت کے عوض چودھری اُس عورت کا جنسی استحصال کرتا ہے۔ منشایاد نے اس افسانے میں 'غریب کی بیٹی سب کی جورو' سمجھنے والے سماج کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھایا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"تمہیں یاد ہے چوہدری تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ کیسی کیس غلیظ خواہشیں۔۔۔ اور کیسے رکھتے تھے مجھے۔ جیسے عورت نہیں کتیا تھی۔ چوہدری میں بھی کسی کی بیٹی تھی مگر تم نے اور تمہارے جیسوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ تمہیں معلوم ہے؟ میں تو بڑی معصوم اور پاک تھی۔ صرف کمزور اور غریب تھی، گھر سے اپلوں کے لیے گوبر جمع کرنے نکلی تھی اور تم لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور مجھے گوبر سے بھی بدتر چیز بنا دیا گیا اور تمہیں منجھلی کا

نام لیتے شرم آنی چاہیے۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ بڑی ساتھ والی گاؤں کے ذیلدار کی اور چھوٹی کا مجھے خود صحیح انداز نہیں تمہاری ہے یا کس کی۔"(۱۰)

لیکن اس افسانے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اِس میں عورت کا اُس کی ذات کی نفی کرنے والے چودھری سے انتقام بھی دکھایا گیا ہے۔ جب تانی اور موجو موچی کی تینوں بیٹیاں جوان ہو جاتی ہیں اور اُن کے حسن کے دیوانے بااثر لوگ موجو کی گھریلو زندگی ہی نہیں بلکہ اُس کے پورے گاؤں کے اقتصادی نقشے کو ہی بدلنے لگتے ہیں تو موجو، موج دین ہو جاتا ہے اور پورا گاؤں جو اُس کے سلام کا جواب تک نہ دیتا تھا اُسے عزت دینا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمارے سماج میں عزت و منزلت کے دوہرے معیارات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ موجو کے گھر کا نقشہ بدلتے ہی چودھری شریف کے موجو کے ہاں آنے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ ردِ عمل میں جب چودھری موجو کو ساجھے پر دیا گیا اپنا کھیت واپس لینے کی دھمکی دیتا ہے تو ادریس جو خود بھی چودھری شریف کے طرح جنسی ہوس مٹانے موجو کے گھر آتا جاتا ہے طیش میں آکر کہتا ہے:

"چاچا شریف! خبر دار جو اس گھر کے کسی فرد کو تم نے کوئی فضول بات کی۔ تمہاری شرافت کو سارا گاؤں جانتا ہے۔ ایک کِلہ زمین کی خاطر تم ان غریب لوگوں پر اتنا رعب جھاڑ رہے ہو، بے شک اپنی زمین واپس لے کو مگر آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"(۱۱)

احمد ندیم قاسمی اور منشایاد کا دونوں کے متذکرہ بالا افسانوں میں موضوع تو ایک ہی طبقاتی استحصال ہے اور اس میں بالخصوص دیہاتی سماج کے بالائی یا بااثر طبقے کی طرف سے نچلے یا غریب طبقے کا جنسی استحصال ہے لیکن دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں اس موضوع کی ٹریٹمنٹ منفرد ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں کردار اور مناظر کا تاثر وہ نہیں بن پاتا جو منشایاد کے افسانے میں ہے۔ قاسمی صاحب کی کہانی نسبتاً سپاٹ ہے لیکن منشایاد نے کرداروں کی نفسیات میں اتر کر کہانی کے کلی تاثر کو بہت گہرا بنا دیا ہے۔

ان دونوں افسانہ نگاروں نے ہمارے دیہاتوں کی اُس عورت کو بھی موضوع بنایا ہے جو سماجی ڈھانچے کی نام نہاد اقدار کے سامنے مجبور ہے۔ وہ حتی الامکان ان اقدار کی پاسداری کرتی ہے کیونکہ ان کی پاسداری کرنا اس پر مرد سے کہیں زیادہ لازم ہے۔ لیکن اکثر اوقات وہ اپنے جنسی جذبات کے سامنے بے بس بھی ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر جب کسی مرد کی محبت کے جھانسے میں آجائے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے 'سائے' کی ایک نوجوان دوشیزہ آشی کبڈی کے کھلاڑی نازو کے عشق میں مبتلا ہو کر آخری حد تک چلی جاتی ہے لیکن نازو اُسے دھوکا دیتا ہے اور اپنے ایک

دوست شہری بابو کی جنسی ہوس کی تسکین کے لیے بھی آشو کو استعمال کرتا ہے، نتیجتاً خودکشی ہی آشی کا نصیب بنتا ہے۔ لیکن محبت میں پڑنے سے قطع نظر احمد ندیم قاسمی نے ہمارے سماج کی اُس عورت کو بھی دکھایا ہے جس کی جنسی تسکین کسی طور جب اُس کے اپنے مرد سے پوری نہ ہو تو وہ مجبوراً تمام سماجی قدروں کو روندھتے ہوئے دوسرے مردوں سے رجوع کرتی ہے۔ اُن کے افسانے 'نامرد' کی لاڈلی عرف چنوں ایک غیر شادی شدہ مرد سلیم کی طرف اس لیے مائل ہوتی ہے کیونکہ اس کا شوہر دو سال سے جہلم کی جیل میں قید ہے اور لاڈلی جنسی خواہش کی تکمیل سے تشنہ ہے۔ یہی موضوع ایک اور افسانے 'السلام علیکم' میں بھی سامنے آتا ہے جو بظاہر جنگ کی ہولناکیوں کے حوالے سے لکھی گئی کہانی ہے لیکن اس افسانے کا مرکزی کردار امیر خان جب تین سال جنگ کے محاذ پر بیرونِ ملک گزارنے اور فرانس میں ایک فرانسیسی خاتون لیوسی کے ساتھ خوش کن جنسی تعلقات استوار رکھنے کے بعد دو ماہ کی چھٹی پر گھر لوٹتا ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ اُس کی بیوی نے بھی کسی دوسرے مرد سے جنسی تعلق استوار کر رکھا ہے۔ ناقدین نے بظاہر اسے جیسی کرنی ویسی بھرنی ایسے موضوع سے جوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں افسانے کا موضوع دراصل عورت کے وہ جنسی جذبات ہیں جس کی ہمارے سماج کا مرد ہمیشہ نفی کرتا ہے۔ منشایاد کے ہاں بھی دیہی زندگی کے پس منظر میں یہ موضوع مختلف افسانوں میں ملتا ہے۔ اس حوالے سے اُن کا سب سے موثر افسانہ 'پانی میں گھرا ہوا پانی' ہے۔ اس کا کردار دِتہ کمہار بانجھ ہے اور بھینس اور گدھی کے عوض خرید کر لائی ہوئی اپنی خوبصورت بیوی زیناں کو اولاد نہیں دے سکتا۔ زیناں ایک حد تک تو اپنے جنسی جذبات کو ضبط میں رکھتی ہے اور دِتے کمہار کے ساتھ زندگی کے ایام گزارتی رہتی ہے لیکن آخر جوانی کی منہ زور آگ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور اسے بجھانے کے لیے غیر مرد سے جنسی تعلق استوار کرتی ہے۔ زیناں کی زبان سے دِتے کے لیے یہ جملے ادا کرا کے کہ "تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو، تمہیں کیا پتا کہ آگ کیا ہوتی ہے؟ تم آوے میں چیزیں پکاتے ہو لیکن تم نے آوی میں پک کر کبھی نہیں دیکھا، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں آگ میں گھری ہوئی آگ ہوں"[۲]، منشایاد نے ایک مجبور عورت کی جنسی کیفیات کو قارئین کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔

دیہاتی سماج میں موجود طبقاتی فرق صرف عورت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات مرد کی جنسی خواہشات پر بھی مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ منشایاد کے افسانے 'کچی پکی قبریں' کا کوڈو فقیر جب چودھری بخشے کے بیٹی نوراں سے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے تو صرف اُس کا دیدار کرنے کے لیے دن میں دو دفعہ بھیک مانگنے گاؤں کا رُخ کرتا ہے، بصورتِ دیگر اس کا مسکن قبرستان ہے۔ اُسے اپنے اور نوراں کے درمیان طبقاتی فرق کا پوری طرح احساس ہے،

سو وہ نوراں کو بس اپنی تصوراتی دنیا میں ہی حاصل کر کے اور اپنی خواہش کے مطابق محسوس کر کے خوشی حاصل کرتا ہے۔ وہ اُسے اپنے تصور میں ہی نہر میں نہاتے دیکھ کر تسکین حاصل کرتا ہے۔ منشایاد نے کوڈو فقیر کے ذریعے پیٹ اور جنس کی بھوک کو انسان کی بنیادی ضرورتوں کے طور پر دکھایا ہے اور یہ بھی کہ انسان کی سماجی حیثیت اس پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔ 'کچی پکی قبریں' کا کوڈو فقیر اپنے سماج کی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لیے اپنے والدین کی قبروں سے ہڈیاں نکال کر چودھری کے والدین کے قبروں میں ڈال دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اب اس کے ماں باپ کی قبروں پر بھی دیے جلتے رہیں گے۔ وہ بوٹی پی کر نہر کنارے بیٹھتا ہے تو اُسے ہر چیز سرسبز لگتی ہے۔ کوڈو فقیر نہر کا سارا پانی پی کر اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے لیکن پانی پر بھی طاقتوروں کا اختیار ہے۔ وہ قبروں اور جانوروں کے درمیان رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ یہاں وہ کسی بھی طاقتور کے رعب سے آزاد ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "قبروں کے درمیان جابجا بوٹی اُگی ہے جس کے چند پیالے پی کر اسے عرش کے کنگرے نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی بھی اس کا جی چاہتا ہے ساری بوٹی کاٹ اور پیٹ کر کنویں میں ڈال دے اور اس میں کود جائے۔ قبرستان میں اسے بہت آرام ہے۔ روحیں اس پر رُعب نہیں جماتیں بازپرس نہیں کرتیں، بازپرس نہیں کرتیں، اور مردے اس سے بیگار نہیں لیتے۔"(۱۳)

منشایاد کا یہ کردار اُن کے چند لازوال کرداروں میں سے ایک ہے۔ اس کی حرکات اور خواہشات میں ہمارے سماج کے بالائی طبقے کا نچلے طبقے کی طرف رویہ عیاں ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی اس رویے کو کئی افسانوں میں موضوع بنایا گیا ہے لیکن اُن کے ہاں پسے ہوئے یا مظلوم، لاچار اور غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے زیادہ کردار خواتین کے ہیں۔ قاسمی صاحب کے افسانے 'کفارہ' میں متذکرہ طبقاتی فرق جس کردار کی محبت کے آڑے آتا ہے وہ 'کچی پکی قبریں' کے کوڈو فقیر کی نسبت ایک مثبت کردار ہے۔ وہ زمیندار پیر محمد پیرو کا کردار ہے۔ پیرو کو جس سے محبت ہوتی ہے وہ نورے دھوبی کی بیٹی کموں ہے۔ پیرو کے جذبات کے سامنے بار بار خاندانی تفاوت آجاتا ہے اور وہ یہ سوچ کر خاموش ہو رہتا ہے کہ اس رشتے کو کبھی بھی اس کا سماج عزت نہیں دے گا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "اس کے جذبۂ غیرت نے انگڑائی لی، آخر لوگوں کے شکوک سچ نکلیں گے نا۔۔۔ اور پھر زمیندار اور دھوبن کے اس معاشقے کا قصہ نون مرچ کی تہوں پر تہیں قبول کرتا گردو پیش

سیلاب کی طرح چھا جائے گا اور لوگ پیرو کے باپ اور کموں کے باپ اور پھر ان کی سات پشتوں کی تاریخ سے کیڑے نکالیں گے۔"(۱۴)

قاسمی صاحب نے اس افسانے میں محبت اور غیرت دونوں جذبات کو ایک ساتھ پیش کیا ہے لیکن یہاں بھی اگر تقابلی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو قاسمی صاحب کے ہاں نچلے طبقے کا کردار 'کموں' اتنا موثر نہیں جتنا منشایاد کا کردار کوڈو فقیر ہے۔ اس کی ممکنہ وجہ یہ ہے کہ قاسمی صاحب نے دیہی ثقافت کی پیش کش پر جتنا زور دیا ہے منشایاد نے کردار نگاری پر اتنی ہی توجہ دی ہے۔ بعض اوقات یہ احساس غالب ہو جاتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی پنجاب کی دیہی ثقافت میں چودھریوں، زمینداروں اور جاگیرداروں کے رویوں کو سمجھنے اور ان کے نچلے طبقے سے برتاؤ کا جتنا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں اتنا نچلے طبقے کے کرداروں کی زندگی کا نہیں رکھتے کیونکہ اُن کے یہاں اگر نچلے طبقے کے کرداروں کو کہانیوں کا حصہ بنایا بھی گیا ہے تو وہ کردار اُس طرح سے اپنی تمام شخصی خصوصیات کے ساتھ سامنے نہیں آسکے جیسے بالائی طبقے کے کردار آئے ہیں۔ منشایاد کے ہاں دیہات کے نچلے طبقے کے کرداروں اور ان کی زندگی کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امجد طفیل کا یہ تجزیہ درست ہے کہ:

"منشایاد کے کردار اکثر معاشرے کے انتہائی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوڈو فقیر، علیانائی، دِتہ کمہار، صادو ترکھان، شیر و مہترانی، منشا کے بہت مضبوط کردار ہیں۔ جو معاشرے کے بے زبان طبقے کو پیش کرتے ہیں۔ یہ کردار طبقاتی تشدد کے باوجود اپنے باطن میں ایک محبت کرنے والا دِل رکھتے ہیں۔"(۱۵)

مثال کے طور پر اُن کا ایک اور مشہور کردار ناتو سانسی ہے جو افسانے 'ماس اور مٹی' کا مرکزی کردار ہے۔ اس افسانے کا موضوع بھی یوں تو طبقاتی فرق ہے لیکن اِس میں زیادہ توجہ اُس طبقاتی فرق کے انتہائی تکلیف دِہ نتائج پر مرکوز ہے۔ ناتو سانسی کی زندگی میں غربت، ناانصافیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے تمام معاشرتی اقدار مر چکی ہیں اور صرف ہوس باقی رہ گئی ہے۔ اُسے ماس کھانے کی ہوس ہے کہ یہ ماس ہی اس کے وجود کا استعارہ ہے۔ مٹی یہاں فنا کی علامت ہے۔ ماس کی ہوس سے شروع ہو کر مٹی ہو جانے تک کا سفر انسانی زندگی کی کل کہانی ہے۔ ناتو کے کردار کے ذریعے انسان کی فطری بھوک کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ماس کھانے کے لیے وہ چوریاں کرتا ہے، پہلے مردار کھاتا ہے، پھر زندہ جانوروں کا گوشت کھانے لگتا ہے، پھر اس ایک ہی طرح کی خوراک سے تنگ آتا ہے تو شہری خوراک میں تسکین تلاشتا ہے۔ پیٹ کی بھوک سے جنس کی بھوک تک آتا ہے تو اُس کے لیے اپنے سگے رشتوں کی بھی

کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مادو جو اُس کی سگی بہن ہے اُسے بھی جنس کی بھوک مٹانے کا ذریعہ بنانے میں اُسے کوئی عار نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ناتو جب اپنے باپ شیرو سے اس بابت تذکرہ کرتا ہے تو وہ بھی بیٹی کے بارے میں ایسے کوئی جذبات نہیں رکھتا جو ایک باپ کے ہوسکتے ہیں۔ منشایاد کا یہ افسانہ ہمارے دیہاتی سماج کے اُس نچلے طبقے سے متعلق ہے جو شودروں سے بھی کم حیثیت کے حامل قرار دیے جا چکے ہیں، جو مردار کھاتے ہیں اور انتہائی غیر فطری زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں انھیں چُوڑے، چمار یا سانسی کہا جاتا ہے اور ان کے ساتھ انسانوں نہیں بلکہ جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ چُوڑا جس برتن کو چھُو لے اسے پلید سمجھا جاتا ہے۔ انسانی معاشرے کی طرف سے دھتکارے ہوئے ایسے طبقے کی زندگی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اُس طبقے سے حرام حلال کے فرق اور صحیح غلط کی تمیز کی توقع رکھنے والے سماج کو خود اپنے اندر جھانک کر انسانیت کی بازیافت کی ضرورت ہے۔ 'ماس اور مٹی' پر مختلف اعتراضات بھی ہوئے لیکن ان کے باوجود اسے منشایاد کے چند یادگار افسانوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے بھی سماج کی طرف سے اِسی دھتکارے ہوئے طبقے کو موضوع بنایا ہے ۔ اس ضمن میں اُن کا افسانہ 'سانولا' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ سانولا ایک چمارن کا بیٹا ہے اور اسی بنیاد پر وہ اپنے سماج کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ لوگوں کا رویہ اُس کے ساتھ ایسا ہے کہ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ ایسا سیاہ دھبہ ہے کہ جسے کوئی اپنے جسم یا لباس پر نہ لگنے دے۔ سانولا جب کہیں سے ایک لڑکی بیاہ لایا تو لوگوں نے اس پر بھی اپنی حیرانی کو لڑکی کی نیچ ذاتی سے ملانے کی کوشش کی، مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

> "عقب میں کھڑے ہوئے لوگ کھسک گئے۔ چند نوجوانوں نے سانولے کی شادی پر رسماً خوشی کا اظہار کیا اور اُسے مبارکباد کہتے جب گلی میں آئے تو چوکیدار نے سب کے دِلوں میں ایک تیر سا گاڑ دیا۔
>
> "کہیں سے بھگا کر لایا ہے"۔ اُس نے لٹھ کو دیوار سے لگا کر کہا۔ "ورنہ بھئی چمارن کے لڑکے کو داماد کون بنائے گا"۔
>
> "کوئی چمارن ہی ہو گی"۔ ایک دِل جلا پکارا۔"(۱۶)

گو کہ احمد ندیم قاسمی کا یہ کردار سانولا منشایاد کے ناتو سے کمزور کردار ہے لیکن دونوں افسانہ نگار اپنے کرداروں کے ساتھ سماج کے رویوں اور اُن رویوں کے نتائج کو موثر انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور منشایاد نے دیہاتی زندگی کے ایک اور بہت اہم کردار مولوی کی نفسیات کو بہت عمدگی کے ساتھ اپنے افسانوں میں

پیش کیا ہے۔ اس باب میں احمد ندیم قاسمی کا سب سے شاندار افسانہ 'الحمد اللہ' جبکہ منشایاد کا 'آدم بو' ہے۔ ان دونوں افسانوں کے مولویوں میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا میں اُن کی سوچ مثبت تھی لیکن جونہی ذاتی مفادات کا لالچ اُنھیں گھیرتا ہے اُن کی سوچ منفی ہو جاتی ہے اور خود غرضی کا عنصر اُن پر غالب آ جاتا ہے۔ پنجاب کے دیہاتی زندگی میں جس طرح چودھری ایک مکمل ادارہ ہوتا ہے اِسی طرح مولوی بھی ایک ادارے کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ دونوں ادارے باہمی گٹھ جوڑ سے پورے گاؤں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ صحیح غلط کے تمام فیصلوں اور استحصال کی تمام صورتوں کا براہِ راست انھی دو اداروں سے تعلق ہوتا ہے۔ 'الحمد اللہ' میں احمد ندیم قاسمی نے یہ دکھایا کہ جب اِن دونوں میں سے کسی ایک ادارے پر ذاتی مفاد، لالچ اور خود غرضی غالب آ جائے تو اُس کے لیے وہ دوسرے کو لتاڑنے سے نہیں چوکتا۔ مولوی ابوالبرکات عرف ابل کو اپنی سماجی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے چودھری فتح داد کی موت بھی ایک خوشخبری اور خدا کا شکر بجالانے کا مقام ہے۔ گاؤں کا نمبردار چودھری فتح داد ہمیشہ مولوی ابل کی ہر مشکل میں مدد کرتا، بلکہ اُس کثیر الاولاد مولوی کے گھر کا تمام انحصار ہی چودھری فتح داد پر تھا۔ چودھری فتح داد نے ہی مولوی کی بیٹی مہرالنسا کی شادی میں مدد کی تھی۔ اب جب اُس بیٹی کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا اور مولوی صاحب نے اپنے گھر میں فاقوں کے باوجود سماجی رواج کے مطابق اُس بچے کو نئے کپڑوں اور کھلونوں کے ساتھ دیکھنے جانا تھا تو چودھری فتح داد کی موت اُس کے لیے خوشی کی خبر بن جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "اور مولوی ابل اسی بجتے ہوئے لہجے میں چلایا: "مبارک ہو عارف کی ماں! تم نواسے کے چولے کو رو رہی تھی، اللہ جل شانہ نے چولے، چُنی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا۔۔۔ چودھری فتح داد مر گیا ہے نا۔"
>
> زیب النسا نے اس زور سے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا کہ بچے دہل کر رہ گئے۔
>
> اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ہے۔ اس کی اوپر اُٹھی پتلیاں بہت اوپر اُٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیتا تھا، چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا۔"(۱۷)

احمد ندیم قاسمی نے افسانے کے اس آخری منظر میں یہ بھی دکھایا ہے کہ جب انسان کے باطن میں غم نہ ہو لیکن معاشرے کو دکھانے کے لیے غم زدہ بھی نظر آنا ضروری ہے تو جائز ناجائز اور شرع کا معاملہ بھی ایک طرف رِہ جاتا ہے۔

منشایاد کے افسانے 'آدم بو' کا مولوی اللہ رکھا بھی ٹھیک اِسی طرح ابتدا میں جن باتوں کی نفی کرتا تھا یا انھیں پسند نہ کرتا تھا بعد میں وہ سب خود کرنا شروع کر دیتا ہے۔ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنے، حق بات سب کے منہ پر کہنے اور کسی بھی موقع پر نذر نیاز نہ لینے ایسی سب باتیں ہوا ہو جاتی ہیں جب مولوی اللہ رکھا کے منھ کو پیسہ کا نشہ لگتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی خود داری کو کھا جاتی ہیں۔ مولوی اللہ رکھا شروع میں ایسا نہیں تھا بلکہ ایک درویش صفت اور محنت کر کے کھانے والا انسان تھا۔ قرآن کی تعلیم مفت دینے، مویشی چرانے، اینٹیں ڈھونے، ختم کی چیزیں غریبوں میں تقسیم کرنے، مسجد میں رِہ کر خود وہاں جھاڑو دینے والا مولوی اللہ رکھا خوددار انسان تھا جبھی حق کی بات ڈنکے کی چوٹ پر کرتا تھا۔ تاہم شادی کے بعد جب گھر بچوں سے بھر گیا تو حالات میں کسمپرسی آ گئی۔ 'الحمد اللہ' کا مولوی ابل ہو یا 'آدم بو' کا مولوی اللہ رکھا، یہ عموماً بڑے عیال دار ہوتے ہیں کیونکہ وہ آبادی کم رکھنے کے خیال کو بھی غیر مذاہب کی سازشوں میں شمار کرتے ہیں۔ مولوی اللہ رکھا اپنے زیادہ بچوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے سے قاصر تھا سو جب حالت فاقوں تک آ گئی تو اُس کی بیگم نے چوری چھپے نذر نیاز اور ختم کی اشیا بھی قبول کرنا شروع کر دیں۔ گاؤں کے ذیلدار کے انتقال پر مولوی صاحب کے تمام کنبے کے لیے پہناوے مع اعلیٰ قسم کی خوراک حاضر کیے گئے تو انھوں نے کہا کہ "میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ کسی کے ہاتھ سب چیزیں ہمارے گھر پہنچا دی جائیں"[۱۸]، اس ایک جملے میں ہی مولوی اللہ رکھا کی طرف سے کئی طرح کے اعلانات شامل ہیں۔ ایک طرف وہ اپنی خودداری دکھانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اپنے معاشرے کے ساتھ ایک نئے خاموش معاہدے کی خواہش بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ اِس خاموش معاہدے کے نتیجے میں اُس کی امامت کا دائرہ ایسا پھیلا کہ قریب قریب ہر گاؤں اور وہاں کے کرتا دھرتا سب اُس کے دائرۂ اثر میں آتے گئے۔ مولوی اللہ رکھا نے مذہب کا خوب استعمال کیا، نتیجتاً اُسے کسی سے کچھ مانگنے کی بھی ضرورت نہ رہی کیونکہ لوگ اپنی آمدن میں سے اللہ کے حصے کا اصل حق دار اُسی کو سمجھتے ہوئے خود بخود سب کچھ پہنچا دیتے تھے۔ ریاکاری کا نقاب اوڑھنے والے مولوی اللہ رکھا اور اُس کے گاؤں کے اُس بڑے ملک میں اب کوئی فرق باقی نہ رہا تھا جو مولوی کے شباب اور ایمانداری کے زمانے میں اُسے مکروہ لگتا تھا اور جو گاؤں کے داخلی راستے پر بیٹھا آدم بو آدم بو پکارتا رہتا اور جس کے جسم سے مولوی کو ایسی بدبو آتی کہ متلی آنے لگتی۔ افسانہ نگار

یہ افسانے کے اختتام پر دکھایا ہے کہ یہ دراصل اُس حرام مال کی بدبو تھی جس سے اب مولوی اللہ رکھا کا پیٹ بھی بھر گیا تھا۔ اقتباس دیکھئے:

> "رات کو وہ تھکے تھکے اور نڈھال گھر لوٹتے ہیں اور دالان میں بچھی بڑی چارپائیوں کے قریب سے گزر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آتے ہیں۔ بی بی جی اُن کی آہٹ سن کر لمحہ بھر کے لیے جاگتی ہیں، پھر خراٹے لینے لگتی ہیں۔ وہ اپنے سرہانے تپائی پر رکھا ٹھنڈے دودھ کا گلاس اٹھاتے اور گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں لیکن اچانک انھیں ایک جانی پہچانی مگر ناگوار سی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور جی متلانے لگتا ہے۔ وہ دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ دیتے ہیں اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہیں۔ انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر بدبو کے بھبکے لپلپے چلے آتے ہیں اچانک انھیں یاد آتا ہے کہ یہ بدبو ویسی ہی ہے جیسی بڑے ملک کے جسم سے اُٹھتی تھی وہ قے روکنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر وہ نہیں رکتی۔"(۱۹)

منشایاد نے اس افسانے میں مذہبی منافقوں کے چہرے سے نقاب اُٹھایا ہے اور یہ دکھایا کہ مولوی کا ادارہ بھی کسی طرح ایک ظالم، جابر، ریاکار چودھری، ملک، جاگیر دار، ذیلدار یا وڈیرے سے کم بدبودار اور استحصالی نہیں ہے۔ اس کے استحصال کرنے کا طریقہ مختلف ہے لیکن اُس کے پاس جو طاقت ہے وہ مذہب اور منبر کی ہے جسے وہ بھرپور طریقے سے معصوم انسان پر استعمال کرتا ہے۔ متذکرہ بالا افسانوں 'الحمد اللہ' اور 'آدم بو' میں احمد ندیم قاسمی اور منشایاد کی فکر اور فن میں بڑی حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں کے ہاں موضوع کی پیش کش کے لیے کرداروں، مناظر اور زبان و بیان میں بہت زیادہ محنت کی گئی ہے، دونوں نے اپنی کہانیوں کو پنچ لائنز تک بھرپور انداز میں آگے بڑھایا ہے، اسی لیے قاری پر دونوں کی اثر انگیزی یکساں ہے۔ مولوی کے منافقانہ کردار پر احمد ندیم قاسمی اور منشایا کے افسانوں میں 'پل صراط'، 'ثواب'، 'ہٰذا من فضلِ ربی'، 'کوکھ پر پاؤں'، 'پھندا' اور 'ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ' وغیرہ شامل ہیں۔ دیہاتی معاشرے کے کم و بیش تمام اہم موضوعات پر احمد ندیم قاسمی اور منشایاد کے افسانے موجود ہیں۔ مثلاً ایک اور اہم موضوع توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی ہے جس پر اُن کے افسانوں میں 'ایک رات چوپال پر'، 'چڑیل'، 'بھوت'، 'گڑیا' اور 'ماسی گل بانو' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دیہاتی سماج میں بھی شہری سماج کی طرح ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے عورتوں کی زیادہ تعداد متاثر ہوتی ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے جال بچھانے والوں کا آسان شکار وہ بنتی ہیں۔ کوئی اولاد کی خواہش میں، کوئی گھریلو تشدد کی وجہ سے، کوئی

معاشی تنگ دستی اور کوئی شادی اور رشتے کی دعا کرانے کے چکر میں پیروں فقیروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور منشایاد نے اپنی کہانیوں میں ان تمام زاویوں سے ضعیف الاعتقادی کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔

متذکرہ بالا دونوں افسانہ نگار بلاشبہ دیس پنجاب کی روح سے جڑے ہوئے تخلیق کار ہیں۔ دونوں کے تقابل سے مجموعی رائے قائم کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے پاس دیہاتی زندگی سے جڑے ہوئے موضوعات بہت زیادہ اور متنوع ہیں۔ وہ چونکہ ترقی پسند تحریک سے براہِ راست وابستہ تھے اس لیے اُن متنوع موضوعات کی پیش کش میں وہ اپنے دیگر فکری ساتھیوں پریم چند، کرشن چندر اور بیدی وغیرہ کی اپروچ سے قریب تر ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے خطے کے استحصال زدہ دیہاتیوں کی زبان بن کر معاشرے کو اُن کی زندگیوں کی تلخیوں اور نا انصافیوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ اُن کے لاشعور میں استحصال زدہ طبقے کی زندگیوں کو بدلنے کا خواب، طاقتوروں کے خلاف ردِ عمل یا بغاوت کی خواہش اور انسان کی حقیقی آزادی کا ایک آدرش موجود ہے اور چوتھا اور آخری نکتہ اُن کے فن کے بارے میں یہ قائم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تینوں نکات میں بیان کردہ محرکات کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں کرداروں کو مرکزیت دے کر نمایاں رکھنے کے بجائے اُن حالات کو مرکزیت دی جس میں وہ کردار زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کا مقصد اپنے قارئین پر کوئی ادبی، جمالیاتی یا روحانی اثر چھوڑنا نہیں بلکہ اپنے معاشرے کی زبوں حالی، تضاد، پسماندگی اور انسانی اقدار کی شکست و ریخت کو پیش کرنا تھا جس کے لیے انھوں نے اسلوب پر بھی توجہ دینے سے زیادہ ابلاغ کو اہم سمجھا۔ منشایاد تھوڑے سی مختلف مزاج کے آدمی تھے۔ حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ رہے اور فکری اعتبار سے جدیدیت کے قریب سمجھے جا سکتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کا مشاہدہ اُن کے ہاں بھی بہت گہرا ہے لیکن وہ اُس کی پیش کش میں بھی فنی مہارت کو بہت زیادہ بروئے کار لاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہانی کی ساخت پر منشایاد نے احمد ندیم قاسمی کی نسبت بہت زیادہ توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں کا ادبی اور جمالیاتی اثر قارئین پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دیہاتی زندگی کی پیش کش کے پس منظر میں دیکھا جائے تو منشایاد کے افسانوں کی سب سے نمایاں خاصیت وہ زندہ کردار ہیں جن کے اندر دیہات چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور پھر اُن کی زبان جو پنجاب کا حقیقی رَس اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ منشایاد کے جملوں کی روح میں وہ دہقانیت موجود ہے جو احمد ندیم قاسمی کے مکالموں میں نظر نہیں آتی۔ بہر صورت یہ دونوں افسانہ نگار اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ اُردو افسانے میں پنجاب کی دیہاتی زندگی کی پیش کش کا اہم ترین حوالہ ہیں۔ ان دونوں نے ہمیشہ اپنے گرد و پیش کی زندگی

کو روشن دل سے محسوس کیا اور اپنے اوپر مسلط کر کے یوں بیان کیا کہ اپنے دیس کے کمزور طبقات کی زبان بنے۔ یہی ایک سچے ادیب کا حقیقی نصب العین ہوتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ سلیم سالک، اردو افسانہ: مزاج و منہاج ادبی مذاکرے، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۱۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۔ فیض احمد فیض، میزان، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۰، ۲۰۹

۴۔ شمس الرحمن فاروقی، بلونت سنگھ کے افسانے، مشمولہ: آج کل، نئی دہلی: جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۲۶

۵۔ بلونت سنگھ، پہلا پتھر، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۳۵ء، ص ۱۷۶

۶۔ انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، الٰہ آباد: اُردو رائیٹرز گلڈ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰

۷۔ انوار احمد، اُردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء، ص ۵۰۹

۸۔ احمد ندیم قاسمی، انتقام، مشمولہ: چوپال، لاہور: اساطیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۹

۹۔ احمد ندیم قاسمی، میر ادیس، مشمولہ: طلوع و غروب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۹۵

۱۰۔ منشایاد، ساجھے کا کھیت، مشمولہ: شہر فسانہ، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳۳

۱۲۔ منشایاد، پانی میں گھرا ہوا پانی، مشمولہ: ماس اور مٹی، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۳۳

۱۳۔ منشایاد، میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء، ص ۸۷

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، کفارہ، مشمولہ: آبلے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳

۱۵۔ امجد طفیل، منشایاد کی افسانہ نگاری، مشمولہ: پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، راولپنڈی، گندھارا، ۲۰۰۲ء، مرتبہ: نوازش علی، ص ۲۸۷

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، سانولا، مشمولہ: آنچل، دہلی: شفیق بک ڈپو، ۱۹۴۴ء، ص ۱۸۴، ۱۸۳

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، الحمد اللہ، مشمولہ: سناٹا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۹، ۱۲۸

۱۸۔ منشایاد، میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا، ص ۲۲۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۵، ۲۲۴